Fikr-o-Nasar (Islamabad) 13:10 (1976)
© rasailojaraid.com

شاہ ولی اللہؒ کے معاشی افکار

الٰہی بخش جار اللہ

شاہ صاحب کے نظریات میں سے ایک نظریہ ارتقاءِ عمران واقتصاد (SOCIO - ECONOMIC Evolution) کا ہے۔ ان کا یہی نظریہ اسلامی نظامِ معیشت کے لئے ایک حرکی اور مستحکم بنیاد فراہم کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے اس نظریہ میں نظریۂ ارتقاء کے بنیادی اصولوں، تبدل، نظام، صراطِ مستقیم، ارتقاء اور استکمال کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ انہوں نے اپنے اس نظریہ کو اسلام کی لازوال بنیادی فکر سے حکیمانہ ربط دیا۔ اور اس تمام حرکیت کی بنیاد ایک ایسی فکری وحدت پر رکھی جو تمام تبدیلیوں کا منبع ہے مگر خود کوئی تبدیلی قبول نہیں کرتی۔ گویا خود غیر متبدل ہے۔ یہ ہے اسلامی فکر کی وہ وحدت و یکسانیت جو تمام افکار کے لئے مرکزی محور کا کام دیتی ہے۔

شاہ صاحب کا یہ نظریہ عمرانی ارتقائی نظریات میں قدیم ترین ہے اور مستحکم و مکمل بھی ہے۔ انہوں نے یہ نظریات اس وقت پیش کئے جب یورپ کے ماہرینِ معاشیات کو اس دنیا میں وجود ہی نصیب نہ ہوا تھا۔ کیونکہ انہوں نے یہ ارتقائی نظریات اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں پیش کئے جب کہ یورپ میں سب سے پہلا ارتقائی نظریہ، خواہ اس کی علمی بنیاد یا ذریعہ کچھ ہو، انیسویں صدی کے نصف آخر میں اس وقت پیش ہوا جب ڈاروِن نے اپنی کتاب ON THE ORIGIN OF SPECIES شائع کی۔ مگر عمرانی افکار میں تو ارتقائی نظریات کا ظہور بیسویں صدی کے ابتدائی بیس سالوں میں ہوا۔[1]

اس تجزیہ میں پہلے ہم شاہ صاحب کے عمرانی ارتقائی نظریہ کا خلاصہ پیش کریں گے اور پھر

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو Encyclopaedia of Social Scienees Evolution

بتائیں گے کہ یہ اسلامی نظام معیشت کے لئے مسلسل خودکار حرکی عمل کی خاطر کیسے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ مگر اس سے پہلے دیگر معاشی نظامات کے بنیادی تصورات پر کچھ لکھنا ضروری ہے۔

ائمہ معاشیات نے معاشی مسئلہ کی بنیاد اس بات کو قرار دیا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر انسانی ضروریات لامحدود ہیں جب کہ وسائل معاش محدود ہیں۔ لازمی امر ہے کہ انسان کو اقتصاد کا سہارا لینا پڑے گا۔ یہ ہے وہ بنیاد جس پر تمام معاشیات موقوف ہے اور جس پہ ہر ایک معاشی نظام استوار ہوتا ہے یعنی جبلی خواہشات کے مقابلہ میں ذرائع تسکین خواہشات کا بہت ہی کم ہونا۔ ادنیٰ سا تامل اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ یہ نظریہ خالصتاً حیوانی، بالکل بے بنیاد اور سراسر غیر منطقی ہے۔ کیونکہ انسان کی بنیادی معاشی خواہشات اور ان کا احساس ایک جبلی تقاضا ہے جبکہ اقتصادیات کے مسائل خالص عقلی ہیں، یہ نظریہ ان دونوں کے درمیان کوئی ربط نہیں بتاتا۔ پھر یہی نامعقول نظریہ ہے جس نے بلاوجہ دنیا کو دو انتہائی نظریات میں اُلجھا کر متحارب فریقین میں بانٹ دیا۔ کیونکہ جب معاشی ذرائع کا سوال پیدا ہوا تو لازماً معاشی ذرائع کے عناصر پیداوار کا بھی سوال پیدا ہوا۔ یہاں سے سوچ بٹ گئی۔ ایک فریق نے یہ سوچا کہ عناصر پیداوار صرف دو ہیں: زمین اور محنت۔ ان میں سے زمین ایک غیر مستعد (PASSIVE) مگر بنیادی عنصر ہے اس کو کسی مستعد (ACTIVE) عامل کی ضرورت ہے جو اس کے سینے کو چیر کر اس سے خزانے حاصل کرے۔ اس لئے محنت کا عنصر ناگزیر ہے۔ ان دو کے ملنے سے پیداواری عمل مکمل ہو گیا، اب یہاں تیسرے کسی عامل 'عنصر' ادارہ یا فریق کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک حکومت کا سوال ہے یہ انسانی معاشرت و معیشت کا ایک ناگزیر ادارہ ہے۔ یہ اپنے دیگر سیاسی، انتظامی اور معاشی فلاح و بہبود کے فرائض کی بجا آوری کے ساتھ معاشی پیداواریت کی جدوجہد میں تنظیمی ضرورت کو بھی پورا کرے گی۔ لہٰذا حکومت فلاحی کاموں کے لئے بحیثیت تنظیمی عامل اپنا حصہ لے کر باقی محنت کے لئے چھوڑ دے گی۔ اس تصور نے آگے چل کر اشتراکی تصورات پیدا کئے اور ساتھ یہ بھی کہ اس طرح محنت کو اس کا پورا پورا حق مل سکے گا اور محنت بہت خوش ہو گی۔ حکومت اور محنت کے درمیان تیسرا کوئی استحصال کرنے والا نہ ہو گا۔

اس نظریہ میں محنت کو جو بنیادی اہمیت دی گئی ہے اس کا اعتراف بابائے علم الاقتصاد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایڈم اسمتھ نے بھی اپنی کتاب دولتِ اقوام[1] (Wealth of Nations) کے بالکل ابتدائی پیرے میں یوں کہا ہے :-

The Annual Labour of every Nations is the fund which Originally Supplies it with all the Necessities and Conveniences of life which it Annualy Consumes.

لیکن ایڈم اسمتھ نے یہ شرط عائد کی ہے کہ قومی دولت کے اضافہ کے لئے ضروری ہے کہ محنت کی پیداواری قوت کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے۔

اس کے مقابل ایک اور نظریہ پیدا ہوا جس میں بتایا گیا کہ ملک کے معاشی ذرائع پیداوار کا مالک سرمایہ دار ہے اور اصولاً اس کو ہونا ہی چاہیئے، اس لئے قومی پیداوار میں اس کا حصہ لازمی ہے۔ لہٰذا تقسیم اس طرح ہوگی: تین حصے سرمایہ دار کے جو اس ترتیب سے ہوں گے: ایک حصہ بحیثیتِ مالک زمین، لگان کی شکل میں، دوسرا حصہ مالکِ زر کی حیثیت سے سود کی صورت میں، تیسرا حصہ بحیثیتِ ناظم عناصر پیداوار، منافع کی شکل میں۔ اس کے علاوہ عملِ پیداوار میں جو جو کفایتیں ہوں گی، وہ بھی بہرحال اسی کا حصہ ہیں۔ کیونکہ یہ خالصتاً اس کی صلاحیتوں کا نتیجہ ہیں۔ جہاں تک قومی پیداوار میں محنت کے حصے کا سوال ہے، تو اس نظریہ کے وکلا میں سے ان ہمدردانِ عوام نے بھی جو قومی دولت کا دارومدار محنت کو بتاتے تھے، بڑی معذرت کے ساتھ فیصلہ دے دیا کہ محنت کو قومی دولت میں سے "قوتِ لایموت" کی سطح سے زائد نہیں دیا جا سکتا۔

اس نظریہ میں محنت کے ساتھ جو ناقابلِ تلافی زیادتی کی گئی وہ یہ ہے کہ محنت کو جو فی الحقیقت کسی ملک کی ۹۵ فی صد آبادی ہوتی ہے مشین کے کل پرزوں کی صف میں کھڑا کر دیا گیا ہے اور اس کی قیمت متعین کرنے کے لئے اسے بھی اینٹ پتھر کے ساتھ رسد و طلب کے ترازو میں تولا گیا ہے اور اس میں بھی، ڈاکٹر مارشل کے بقول، اس کے ساتھ بہت بے انصافی کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بےچاری اتنی قیمت بھی نہیں پا سکی جو اینٹ پتھر کو میسر آتی ہے۔ اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ سرمایہ دار بھی تو محنت کی طرح ایک فرد ہی ہے۔ کیا اس کی قیمت لگانے کے لئے رسد و طلب کا ترازو قائم کیا جا سکتا ہے؟ مگر یہ کہاں ممکن، وہ جنس ارزاں تھوڑی ہے۔ وہ دُرِ یکتا نایاب، گراں مایہ، انمول

---

[1] Nature and Causes of Wealth of Nations; Adam Smith

اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ اس کی جگہ تو تاج شاہی کے سوا کہیں نہیں۔ اس کی حمایت میں انہوں نے حکومت کو تلقین کی کہ وہ اپنے واجبات اور ٹیکس لیتے ہوئے سرمایہ دار کے ساتھ خصوصیت سے سادگی اور نرمی کا برتاؤ کرے۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ تہذیب و تمدن کے اس دور میں جہاں غلامی جیسے غیر انسانی ادارہ کے وجود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ۹۵ فی صد آبادی کو جس پہ بدقسمتی سے محنت کا لیبل چسپاں ہے وہ حیثیت و قیمت بھی نہیں مل سکی جو جاہلیت و تاریکی کے دور میں غلام کو میسر تھی۔

شاہ صاحب کے نظریہ پر تفصیلی معروضات پیش کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دور کے تقابلی معاشی نظامات (COMPARATIVE ECONOMIC SYSTEMS) کی بحث پر بھی ایک طائرانہ نگاہ ڈال لی جائے۔ کیونکہ اس طرح شاہ صاحب کے بنیادی نظریے کو سمجھنے میں خاصی مدد ملے گی۔ عام طور پر معاشی نظامات کی بحث کرتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کے درمیان حدِ فاصل یا مابہ الامتیاز کی نجی ملکیت کو قرار دیا جاتا ہے گویا سرمایہ دارانہ نظام کے پیچھے نجی ملکیت ہے جو اسے چلا رہی ہے دوسرے لفظوں میں سرمایہ دارانہ نظام میں نجی محرک کا کام کرتا ہے اور اشتراکیت میں حکومت کی قوت اور طاقت۔ مگر یہ تعبیر صحیح نہیں مانی جا سکتی۔ کیونکہ یہ بعد کی ہے، یکطرفہ اور جانبدارانہ ہے۔ اس میں سرمایہ دارانہ نظام کو بہتر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے جس کارروائی اور عمل کو سرمایہ دارانہ نظام کا نام دیا جاتا ہے (ہر چند کہ اس کی اصلی شکل ہمارے سامنے موجود نہیں، اس لئے کہ اس کی موجودہ صورت اصلاح یافتہ ہے اور اسلام کے فلاحی نظام کو دیکھ کر اس کو کافی حد تک قابلِ عمل بنانے کی کوشش کی گئی ہے) وہ معاشی ذرائع کے عملی استحصال کے سوا کچھ نہیں اور اشتراکیت اس کے خلاف ایک ردِ عمل ہے۔ یہ ردِ عمل صرف انیسویں بیسویں صدی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جب بھی سرمایہ دارانہ استحصال معرضِ وجود میں آیا ہے اس کے خلاف مؤثر آواز اٹھی ہے، اور ذرائع معاش پر لامحدود اور بلا روک ٹوک ملکیت کی مشق کو چیلنج کیا گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں۔ اس ردِ عمل کو آگے بڑھانے والوں میں بعض انتہا پسند بھی شامل تھے ایسے لوگ ہر دور اور ہر تحریک میں موجود ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے بے اعتدالیوں کا ارتکاب کیا اور بسا اوقات نشانہ سے ہٹ کر اِدھر اُدھر تیر مارنے شروع کر دیئے۔ اس کے بعد تاریخ نویس حضرات نے ان کے اقوال و اعمال کی داستان قلمبند کرتے ہوئے اپنی پسند و ناپسند کو دخیل بنانے کے لئے خوب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حاشیہ آرائی کی۔ بات کیا سے کیا ہوگئی۔ ادھر صورت حال کو دگرگوں دیکھ کر خود سرمایہ داروں نے بھی اپنے استحصال کو کسی نہ کسی درجہ میں اور کسی نہ کسی نوعیت سے جاری رکھنے کے لئے مزدوروں کی اشک شوئی شروع کردی اور پے در پے پینترے بدلنے لگے۔ پھر سرمایہ دارانہ ذہنیت کے وکلاء نے زیب داستان کے لئے ادھر ادھر سے غیر معاشی، فلاحی اداروں کو لے کر اس نظام سے وابستہ کر دیا۔ حالانکہ ان ادارات کو اگر تعلق تھا تو وہ صرف اسی نظام سے تھا جو انسانیت کی مجموعی فلاح و بہبود کے جذبات پر استوار ہو۔ اور وہ اسلامی نظام کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

بہر نوع، ذرائع معاش پر غیر محدود اور بلا روک ٹوک قبضہ کو معاشی نظام کی بنیاد قرار دینا، جیسا کہ پروفیسر WILLIAM N. LOCKS[1] نے کیا ہے محل نظر ہے۔ جہاں تک اشتراکیت کو ایک نظام کا نام دینے کا سوال ہے تو خود یہی مصنف اس کی بوقلموں نوعیت کو بیان کرتے ہوئے درج ذیل اقتباس نقل کرتا ہے:—

"It is both abstract and concrete, theoretical and practical, idealist and materialist, very old and entirely modern; it ranges from a mere sentiment to a precise programme of action; different advocates present it as a philosophy of life, a sort of religion, an ethical code, and economic system, a historical category, a juridical principle; it is a popular movement and a scientific analysis, an interpretation of the past and a vision of the future, a war cry and the negation of war, a violent revolution and a gentle revolution, a gospel of love and altruism, and a campaign of hate and greed the hope of mankind and the end of civilization, the dawn of the millennium and a frightful catastrophe". [2]

اس تصویر میں مبالغہ ضرور ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس تحریک نے دوسری ان تمام تحریکوں کی طرح جو انسان کے اپنے ماحول کے خلاف ردِ عمل کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں بدلتے ہوئے حالات کے تحت ہمیشہ اپنی نوعیت بدل لی ہے۔ یہ بات بجائے خود اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ اس کو ایک مثبت نظام کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

بعض فضلاء نے اشتراکیت اور سرمایہ داری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اسلام

---

[1] Comparative Economic Systems, 6th Edition, P-17

[2] A. Shadwell, in Quarterly Review, July, 1924 P-2, for reference Pl: see; Comparative Economic Systems: William N. Locks, P-179.

میں ذاتی ملکیت کے تصور کو پھر اس انداز سے پیش کیا ہے جس سے مستحصل سرمایہ دار کو بلا وجہ کی شہہ ملتی ہے۔ اسلام نے یقیناً ذاتی اور انفرادی ملکیت کے ابتدائی تصور کو گوارا کیا ہے مگر استحصال یا ارتکاز کی حد تک پہنچنے سے پہلے اس کی راہ میں سخت رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ جو مذہب ذرائع پیداوار کے ارتکاز پر اس سختی سے جھنجھوڑتا ہو، اسے سرمایہ دار کا پشت پناہ ہونے کا الزام ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔ ارشاد ہے:

والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم
یوم یحمیٰ علیھا فی نار جھنم فتکویٰ بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم ھذا ما
کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون[1]

اس نظام زکوٰۃ میں دیگر حکمتوں کے ساتھ یہ حکمت بھی پوشیدہ ہے کہ سال کے اختتام پر ریاست کو آزادانہ طور پر اس بات کا جائزہ لینے کا موقع ملے کہ فرد پیداواری ذرائع پر کسی حد تک قابض ہو چکا ہے۔ ہر چند کہ اسلام کو اپنے نظام معاش پر اعتماد ہے کہ اس نظام کے تحت کسی کے اژدہا بن جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر بھی وہ سوسائٹی پر گہری نظر رکھنا ضروری سمجھتا ہے تاکہ ہر قسم کی بے قاعدگی نگاہ میں آتی رہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ اس نے سرمایہ دار کو مستقل الٹی میٹم دے رکھا ہے کہ:

فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ

(ترجمہ) اگر تم نے اس طرح نہ کیا تو پھر الٹی میٹم قبول کرو جنگ کا، اللہ اور اس کے رسول سے۔

اس حکم کے ساتھ اگر حضرت ابوبکرؓ کا مانعینِ زکوٰۃ کے سلسلہ میں یہ فرمان بھی ملا لیا جائے:

ومنعونی عقالاً کانوا یؤدونہٗ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاقاتلنھم[2]

تو اس سے عیاں ہو جائے گا کہ اسلام کسی قیمت پر بھی سرمایہ دار کے ایک حد سے آگے بڑھنے دینے کا روادار نہیں۔ پھر کمانے، خرچ کرنے، حلال، حرام، اسراف و تبذیر اور انفاق فی سبیل اللہ کے متعلق مفصل احکامات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام انسان کو دولت کا مالک نہیں بلکہ محض

---

[1] القرآن، توبہ: ۳۵۔

[2] ابن کثیر: البدایہ والنہایہ، طبع دوم ... ۱۹۷۷ء، ۳۱۱ [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایمن بنانا چاہتا ہے۔ وراثت کے قانون میں اس نے مالک کو "اعزازاً" ضرور دیا ہے مگر "اختیاراً" بالکل سلب کر لیا ہے۔ ذاتی ملکیت سخت احکام کے بوجھ تلے دب کر موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہتی ہے۔ اگر وہ دنیا کے لئے رحمت اور ایثار کا پیکر بن کر جینا چاہتی ہے تو بسم اللہ۔ وہ مالک کے لئے بھی رحمت ہوگی۔ ورنہ سرتا سر زحمت ہوگی۔

اسلام نے ذاتی ملکیت کے ادارہ کا سراسر انکار بھی نہیں کیا۔ مگر اپنے حکیمانہ انداز سے اس کی مضرتوں کو ختم یا بالکل کم کر دیا ہے۔ تاکہ معاشرہ میں غریب محنت کش کو مقام مل سکے اور عزت کا جینا نصیب ہو۔ اور وہ معاشرتی طور پر بھی خوشحال زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے۔ اس کا معاشرتی و معاشی ادارت میں اسلام کا یہ طریقِ کار نہایت مؤثر اور جامع عوامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بہت سی معاشرتی و معاشی تبدیلیاں اور اصلاحات اس آہستگی اور خوشی سے لاتا ہے کہ تبدیلی خوشگوار بھی ہو جاتی ہے اور کامیاب بھی رہتی ہے۔

اس بحث سے یہ واضح ہو گیا کہ ذاتی ملکیت ـــ بالخصوص اسلام میں ـــ کوئی ایسا ادارہ نہیں جسے معاشی نظام کا محور سمجھا جائے اسی لئے شاہ صاحب نے بھی اس کو ایسی بنیادی حیثیت نہیں دی۔ انہوں نے معاشی نظام کا ایک حکیمانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ تجزیہ بیک وقت کئی خوبیوں کا حامل ہے۔ جو نظری بھی ہیں اور عملی بھی۔ مثال کے طور پر یہ نظریہ:

۱۔ ترقی پسندانہ (PROGRESSIVE) بھی ہے اور غیر متبدل (UN — CHANGEABLE) بھی۔

۲۔ ارتقائی (EVOLUTIONARY) بھی ہے اور انقلابی (REVOLUTIONARY) بھی۔

۳۔ منطقی (LOGICAL) بھی ہے اور فطری (NATURAL) بھی حتیٰ کہ وہ

۴۔ طبعی (PHYSICAL) بھی ہے اور مابعد الطبعی (META - PHYSICAL) بھی۔

الغرض یہ ان تمام خوبیوں کا جامع ہے جو ایک نظریہ میں ہونی چاہئیں۔

یوں تو شاہ صاحب نے بھی عام ائمہ معاشیات کی طرح معاشی مسئلہ کی بنیاد خواہشات پر رکھی ہے۔ ان میں سے جہاں تک جبلی خواہشات کا تعلق ہے ان میں حیوان اور انسان مشترک ہیں[1]۔ مگر انسانی خواہشات کا

---

[1] یوافق ابناء جنسہ فی الحاجۃ الی الخ، حجۃ اللہ البالغہ۔ ج۔ اول۔ ص ۳۰ (طبع دمشق ۱۳۵۲

دائرہ وسیع تر ہے جو خواہشات سے بڑھ کر ضروریات تک بھی پہنچتا ہے یہ ضروریات جبلی نہیں بلکہ عقلی ہوتی ہیں۔ کیونکہ یا عقلی، ذہنی یا روحانی تقاضوں کے تحت ابھرتی ہیں[1]۔ ان میں سے بعض شخصی ہوتی ہیں اور بعض اجتماعی۔ پھر انہیں معاشی، معاشرتی، سیاسی اور فلاحی تمام ضروریات شامل ہیں

یہی وجہ ہے کہ انسانی خواہشات و ضروریات کی تکمیل ایک باقاعدہ نظام چاہتی ہے۔

اب سوال ہے ان خواہشات کی تسکین کا، جہاں تک عام ماہرینِ معاشیات یا معاشرتی مفکرین کا تعلق ہے ان میں سے کسی نے بھی اس سوال کا جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی، کہ حیوانات میں بالعموم اور انسانوں میں بالخصوص خواہشات کی تسکین کے طریقے کیا ہو سکتے ہیں۔ مگر شاہ صاحب نے اس کا تفصیلی جواب دیا ہے اور پھر جو بات سب سے زیادہ قابلِ اعتبار ہے وہ یہ کہ انہوں نے اس کے ڈانڈے "مابعد الطبیعات" سے ملا دیئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تمام کائنات کا خالق ہے اور اب بھی اس کے رب ہونے کی صفت کی رُو سے ضروری ہے کہ اس کی مخلوقات کے ساتھ اس کا غیر منقطع رابطہ ہر وقت اور ہر آن برقرار رہے۔ تاکہ اس کی ربوبیت کے تقاضے پورے ہوتے رہیں اور یہ رابطہ اللہ اور اس کی مخلوق میں موجود ہے۔ شاہ صاحب کی اصطلاح میں اسے "الہام" کہتے ہیں[2]۔ یہ ایک مجرد حقیقت ہے جو ہے تو ایک مگر اپنے متعلقات کے اختلاف کے سبب اس کی کیفیت بدلتی رہتی ہے[3]۔ اس کی مثال انسانی روح کی ہے۔ وہ بھی ایک مجرد کیفیت ہونے کے باوجود آنکھوں میں نور، دل میں سرور، عقل میں شعور اور وجدان میں

---

[1] والانسان ربما ینبعث الی غرض معقول لیس لہ داعیۃ من طبیعتہ الخ حجۃ اللہ البالغہ ج اول ص ۳۸

[2] شاہ صاحب الہام اور وحی میں فرق مانتے ہیں فرماتے ہیں:
"فرق درمیان وحی و الہام بوجوہ بسیار است" سطعات، سطعہ ۱۶) لیکن الہام اور وحی شاہ صاحب کے نزدیک دونوں "از مقتضائے حقوق تجلی اعظم اند" (سطعہ ۲۰)

[3] البدور البازغہ ص ۱۹۴، فہو بدیہی غیر محتاج الی برہان نازل فی اصل طبیعۃ الانسان نزد العلوم المعاشیۃ فی طبائع البہائم والطیور الخ۔

© rasailojaraid.com

حضور ہے۔ ہاتھوں میں قوتِ بطش، پاؤں میں قوتِ مشی اور زبان میں قوتِ گویائی کی کیفیات اختیار کر لیتی ہے۔ ان تمام شکلوں میں ظہور پذیر ہونے کے بعد وہ وہی رہتی ہے جو ہے۔ یہی کیفیت 'الہام' کی ہے۔

اس الہام کے ذریعے ہر جاندار کو اس کا علم ہوتا ہے کہ زندگی کیسے گذارے۔ فطرت کی منشا کو کیسے پورا کرے۔ اپنے معاشی تقاضوں کا کیسے جواب تیار کرے۔ گویا ان خواہشات کی تسکین کے طریقے الہامی ہیں[1]۔ شاہ صاحب کے نزدیک یہ ہر نوع کی جبلّا معاشی شریعت ہے جو اس کی صورت نوعیہ کے مطابق اس کے افراد کے سینوں میں اللہ کی طرف سے القا کر دی جاتی ہے[2]۔ شاہ صاحب کا خیال ہے کہ معاشی تسکین کا یہ طریق مین فطری ہے۔ اس کو بالکل خارجی نہیں سمجھنا چاہیئے کیونکہ جب خواہشیں جوان ہوتی ہیں تو ہر نوع کی صورت نوعیہ خود بخود متقاضی ہوتی ہے کہ اسے روشنی ملے تاکہ وہ جگمگا اٹھے۔ لہٰذا فطرت کے اٹل اصول کے مطابق مشیتِ ایزدی مساعد ہوتی ہے اور نور ربوبیت سے حصہ نصیب ہوتا ہے[3]۔ یہ تو تکوینی و معاشی الہام کی بات ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک تکلیفی و تشریعی الہام بھی تبقاضائے نوعِ انسانی ہے اس لئے مین مناسب فطرتِ انسانی ہے[4]۔ کیونکہ انسانیت کو جو استعداد و صلاحیت فطرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے وہ زبانِ حال سے آرزومند ہوتی ہے کہ اسے مبدارِ فیض سے حسب حال روشنی نصیب ہو۔ اس کے سبب فیضانِ رحمت ادھر کا رخ کرتی ہے[5]۔ مگر حیوانوں میں جو معاشی الہام جبلت کی معرفت

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغۃ ج اوّل ص ۴۰ و البدور البازغۃ۔

[2] لکل نوع شریعۃ تنفث فی صدور افرادہ من طریق الصورۃ النوعیہ۔ حجۃ اللہ البالغۃ ج اول ص ۳۸

[3] کان من عنایۃ اللہ ۔۔۔۔ الہاماً طبیعاً مقتضی صورۃ النوعیۃ حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱: ۳۸،

۳۹ البدور البازغہ ۵۳ - ۵۵ -

[4] حجۃ اللہ البالغۃ ج اوّل ۲۰ - ۲۴ فتبیہ ان التکلیف من مقتضیات النوع

وان الانسان یسئل ربھم بلسان استعدادہ الخ ..... الطاف القدس: پس صورت

نوعیہ بلسان حال شرع را از مبداء فیض در یوزہ کردہ۔

[5] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو البدور البازغہ ص ۲۸، حجۃ اللہ البالغۃ ۳۸ - ۳۹ -

ہوتا ہے اور انسانوں میں جو الہام جبلت و عقل و ادراک کی معرفت ہوتا ہے دونوں، مبداء و تشخص کے اعتبار سے متحد ہونے کے باوجود، ملہم الیہم کی صورت نوعیہ کے اختلاف کے سبب، کیفیت اور نتائج کے اعتبار سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ حیوانی الہام ساکن رہتا ہے مگر انسانی الہام خود کار حرکی سلسلے کا روپ دھار لیتا ہے۔

شاہ صاحب کی فکر سے واضح ہوتا ہے کہ الہام کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں۔ الہام تکوینی جو اس نظام کائنات کو ترقی دینے اور اس کو برقرار رکھنے کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ یہ جزوی بھی ہوتا ہے اور کلی بھی، اور اس کا تعلق ہر فرد سے ہوتا ہے۔ ان بعض ایسی باتیں جو فہم و ادراک کی متقاضی ہوتی ہیں ان کا تعلق صرف ان سے ہوتا ہے جن کو اس درجہ کی فہم ملی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ الہام ہر ایک سے متعلق رہتا ہے مگر اظہار صرف ان طبائع پہ ہوتا ہے جن میں استعداد و صلاحیت ہوتی ہے! اس میں شاہ صاحب تقویٰ و طہارت کی قید نہیں لگاتے، صرف فہم و ادراک کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

الہام کی دوسری قسم اعلیٰ تر ہے۔ اس سے انسانیت کا کمال معراج وابستہ ہے۔ الہام کی اس قسم کو وحی الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ انبیاء فطری طور پر خاص اسی مقصد کے لئے پیدا کئے جاتے ہیں۔ وہ ابتداء ہی سے حکیم اور معصوم ہوتے ہیں۔ ان کی طبائع غایت درجہ لطیف، ان کی استعداد کامل اور ان کے اخلاق پاکیزہ ہوتے ہیں۔ انہیں فطرۃً حظیرۃ القدس سے ایک ربط ہوتا ہے۔ انبیاء کی تعلیمات میں بھی معاد و معاش کے بنیادی اصول موجود ہوتے ہیں۔ یہ اصول دیگر تمام الہامات کیلئے ضابطہ تصحیح اور (Guideline) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ عام الہامات جن طبائع پہ ہوتے ہیں ان کو وہ کمال اور لطافت نصیب نہیں ہوتی، الہام کے لئے ان کی فہم ادراک اور تعبیر میں لغزش یقینی ہوتی ہے۔ نبوی شریعت ان کی اس غلطی کا ازالہ کرتی اور اعتدال لاتی ہے۔ لہٰذا ان میں سے جو شریعت کے خلاف ہوں ان کو ترک کرنا لازمی ہے۔

شاہ صاحب کی اس تقریر سے مفہوم ہوتا ہے کہ ایسے عام تکوینی الہامات از قسم معاش و معاشرت، جو شریعت کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہوں اور ان کی روح کے متضاد نہ ہوں، منشائے ایزدی کی عکاسی کرتے ہیں اس لئے علوم الاقتصاد وغیرہ کے مسائل جو انسانیت نے اپنے تجربات و الہامات سے ترتیب دیئے ہیں۔ شاہ صاحب کی نگاہ میں قابل تقلید ٹھہریں گے۔ کیونکہ انسانیت کے لئے ضروری ہیں۔ [۱۱]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس اعتبار سے شاہ صاحب اسلامی تاریخ میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے خالص دنیوی علوم کو جو انسان کی دینی زندگی کی فلاح اور ارتقاء سے متعلق ہیں، بشرطیکہ شریعت کے خلاف نہ ہوں، مابعد الطبعی استناد بخشا ہے اور انہیں ملہم من اللہ قرار دیا ہے اور ان کی یہ سوچ قرآنی آیات پر مبنی ہے۔

اس سے ماہرینِ معاشیات کی تمام فکری تفصیلات پر نہ تو مہرِ جواز ثابت کرنا ہے اور نہ ہی ان کو تقدس کا کوئی رنگ عطا کرنا ہے، مگر انسانی کاوشوں کو، خواہ وہ دنیا کے کسی گوشہ سے کیوں نہ کی گئی ہوں، ٹھکرا دینا یا ان سے یوں صرفِ نظر کر لینا کہ جیسے وہ دنیا میں موجود ہی نہیں علم و حکمت سے تعصب روا رکھنے کے مترادف ہوگا۔ حالانکہ ہمارے آقا و مولا نبی اُمّی لقب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:۔

كلمة الحكمة ضالة المومن اينما وجدها فهو احق بها،

اس فرمان کی رو سے تو علم و دانش کی تو زیر جہاں کہیں سے بھی اُبھرے اس کی جگہ بہر حال مومن کا سینہ ہے۔ اور یہ اس کو سمونے کے لئے یُوں فراخ ہے جیسے وہ اس کی اپنی میراث ہو۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان علوم سے پہلو تہی کرنا یقیناً انسانی زندگی کی علمی و عملی ترقی کیلئے مفید نہ ہوگا اگر کچھ لوگوں نے علم و دانش کے انمول ذخیرہ کے ساتھ کوئی ایسا سلوک روا رکھا ہے جو ناروا ہے تو اس کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے۔ اور پھر کفر و ضلالت کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں۔ جدھر چاہے منہ اٹھا کر چل دے۔ مگر مومن کے لئے ایک اور صرف ایک راہ ہے وہ ہے صراطِ مستقیم۔ یہ وہ راہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے متعین کر دی ہے۔ اسے حق نہیں کہ وہ اس سے سرِ مُو اِدھر اُدھر ہو سکے۔ اس لئے دنیا میں جس نے بھی کچھ سوچا ہے اس میں کسی نہ کسی حد تک روشنی کا عنصر ضرور موجود ہے، اور اس سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔

اس کے ساتھ اس امر کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ یورپی ماہرینِ معاشیات نے علمی تفصیلات میں سنگین غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے اور زبردست ٹھوکریں کھائی ہیں۔ بڑی حد تک جمود و تعطل اور اندھی تقلید کا شکار ہوئے ہیں۔ یہاں ہمارے لئے ممکن نہیں کہ ہم ان کی غلطیوں کی تفصیل سے نشاندہی کر سکیں۔ اس وقت صرف دو باتیں بطورِ مثال عرض ہیں۔ پہلی غلطی علمی تجزیہ سے متعلق ہے اور دوسری عملی زندگی میں ان کے طریقِ بحث کی افادیت سے متعلق ہے۔

۱- زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے انفرادی ہو یا اجتماعی۔ انسانی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کے حصّے بخرے کرنے سے جو نتائج حاصل ہوں گے وہ سراسر غیر حقیقی ہوں گے۔ اسی لئے قرآن مجید نے زندگی کے اعمال و افعال پر تبصرہ اور ان کا تجزیہ کرتے ہوئے ان اعمال کی عکاسی بعینہٖ اس ترتیب سے کی ہے جس ترتیب سے وہ عملی زندگی میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ یہی فطری اور صحیح طریقِ کار ہے۔ اس راہ سے ہٹ کر تجزیہ کر کے جو جو مفروضات قائم کئے جائیں گے وہ یقیناً غلط ہوں گے۔ ہمارے یورپی مفکرین قرآنی راہ سے نہ جانے کیوں منحرف ہیں۔ اور پھر ان کو اس انحراف پر اصرار بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے معاشی ادارات کی افادیت اور ان کی قدر و قیمت کو جانچنے کے لئے ہمیشہ انہیں دیگر معاشرتی ادارات سے بالکل جدا کر کے تجزیہ کیا ہے جس کے سبب انہیں شدید علمی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے اور نتائج کے اعتبار سے وہ سنگین غلطیوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس طرح ان کی کیفیت ان بے بصروں سے مختلف نہیں جن میں سے ہر ایک نے ہاتھی کے کسی ایک عضو کو چھُو کر دیکھا تھا اور اس طرح اپنے طور پر ایک مفروضہ قائم کر لیا تھا کہ ہاتھی ایسا جانور ہوگا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے جس چیز کو چھُو کر دیکھا تھا وہ صحیح تھی اور جو نتیجہ اخذ کیا تھا وہ غلط تھا۔ صورتِ حال یہاں بھی ایسی ہی ہے۔ خدا کا فضل ہے کہ اب ان میں سے کچھ کو اس کا احساس ہونے لگا ہے اگرچہ غلطی سے باز آنے کا ارادہ وہ اب بھی نہیں رکھتے۔

۲- ان کی دوسری زبردست غلطی مبالغہ آمیزی اور ریاضیاتی فارمولوں پر ضرورت سے زیادہ انحصار ہے فطرت کے سادہ اور عام فہم اصولوں کو ریاضیاتی اشکال میں اُلجھا کر ایک چیستان بنا دینے کا رجحان عام ہو گیا ہے۔ اب وہ ریاضیاتی مساواتوں میں ایسے اُلجھے ہیں کہ عملی زندگی میں مساوات کو پانے کا احساس ہی جاتا رہا ہے۔ گویا کاغذ پر ٹیڑھی ترچھی خود ساختہ اشکال میں مساوات پا کر وہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اب معاشرتی مساوات میسّر آگئی اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ وہ اسی میں برابر اُلجھتے چلے جا رہے ہیں۔ نتیجتہً عملی میدان میں ان کی افادیت صفر سے گر کر منفی محض ہو چکی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاہم یہ مباحث نظریاتی افادیت سے یکسر خالی بھی نہیں۔ زاویۂ نگاہ بدلنے کی ضرورت ہے کہ ان کو غیر ضروری موشگافیوں سے پاک کر کے "الہامی تجویزات" کو اجاگر کیا جائے تاکہ اس سے عملی زندگی سدھارنے میں مدد ملے۔ لیکن یہ کام وہی کر سکتا ہے جس کو سید الکونینؐ کی تعلیمات سے نورِ بصیرت حاصل ہو۔ یہ ایک دعوتِ عمل ہے تاکہ دُنیا کو معاشی مسائل کے گرداب سے نکالا جا سکے۔